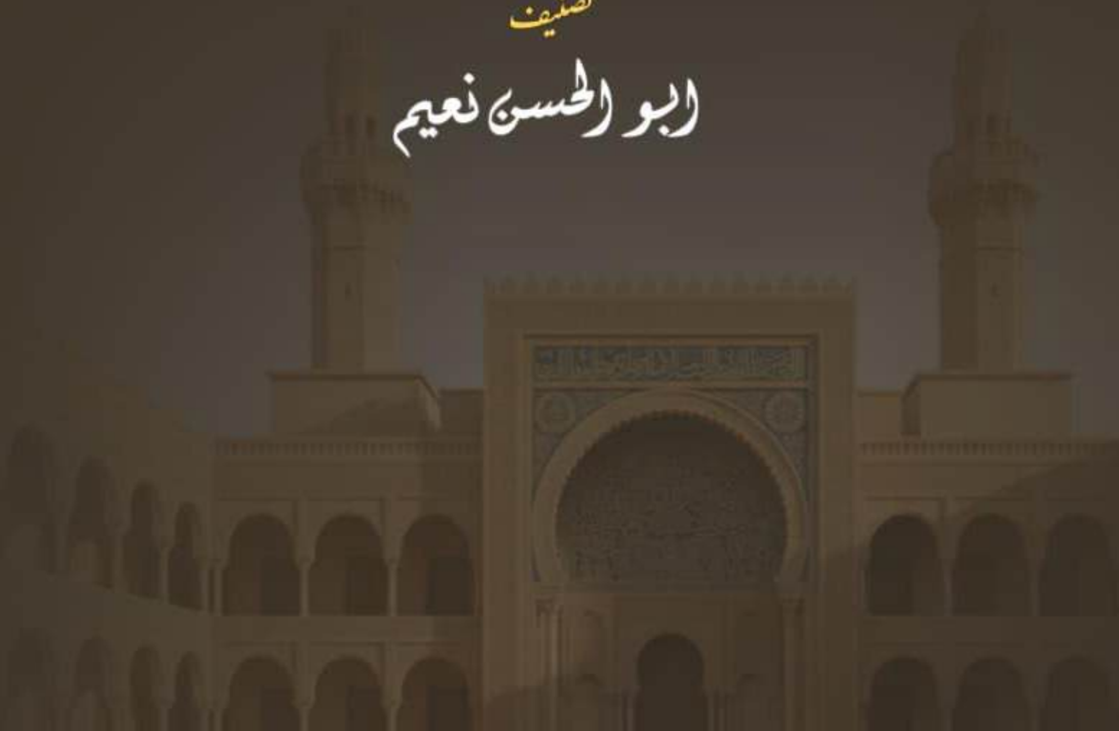
مدارس کے نصاب میں اصلاحات

عصری ضرورتیں اور علمی تجزیہ

تصنیف

ابو الحسن نعیم



مدارس کے نصاب میں اصلاحات

عصری ضرورتیں اور علمی تجزیہ

تصنیف

ابوالحسن نعیم

Contents

پسِ منظر اور تعارف

ادارۂ تعلیم اسلام میں ایک ملی و قومی ادارے کے طور پر متعارف ہے۔ اس ادارے کے تحت جہاں مذہبی تصورات و عقائد کی ترویج و اشاعت اور حفاظت کا کام ہوتا ہے وہیں قوم و ملت کی تشکیل کے لیے رجالِ کار کو تیار بھی کیا جاتا ہے۔ اس ادارے کا پہلا مرکز صفہ کے نام سے رسول اللہ ﷺ نے قائم کیا اور پھر زمانے کے تغیر و تبدل سے اس ادارے کے نام تبدیل ہوتے گئے اور آج ہم انہیں مدرسہ و جامعہ کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

مدارس کا ایک اپنا جداگانہ نظام ہے جو اس کے مقاصد سے نہایت باریک بینی سے مربوط ہے۔ مدارس اپنے مقاصد کے حصول کے لیے ایک مروجہ نصاب رکھتے ہیں جو وہ اپنے طلباء کو پڑھاتے ہیں تاکہ ان مقاصد کا حصول ممکن ہو سکے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ مرورِ زمانہ سے جہاں بھر میں ہر نئے دن کے ساتھ نئی تبدیلیوں کا گزر ہو رہا ہے وہیں تعلیم کے میدان میں بھی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ کچھ علوم اپنی اہمیت کھو چکے ہیں، کچھ تو تبدیلی کے متقاضی ہیں اور

چنداں شعبہ جات نئے قائم ہو رہے ہیں کہ مفکرین کی نگاہ میں آئندہ زمانے میں ان کی ضرورت دوچند ہو جائے گی۔

لیکن مدارس اور مدارس کا نصاب و نظامِ تعلیم وہ واحد ادارہ و نظم ہے جہاں نظامِ تعلیم اور طریقِ تدریس کئی عشروں سے یکساں چلا آرہا ہے۔ کبھی تبدیلی کی لہر اُٹھتی ہے اور امت کا دردِ دل رکھنے والے کچھ اصحابِ فکر تبدل کی ضرورت و اہمیت پر زور دیتے ہیں تو اس وقت چنداں تبدیلیاں رونما ہو جاتی ہیں یا کر دی جاتی ہیں مگر سوال ہنوز باقی رہتا ہے کہ کیا یہ تبدیلیاں کافی ہیں؟ یا یہ پرانے کپڑے پر پیوند کاری کے مترادف ہے؟

دراصل مدارس کے نظامِ تعلیم اور مدارس کے نصابِ تعلیم میں تبدیلی کی جب بھی بات کی جاتی ہے تو تین قسم کے مؤقف سامنے آتے ہیں:

اول یہ کہ یہ نصاب اور نظامِ تعلیم ناکارہ ہو چکا ہے۔ اور اسے مکمل اور یک مشت رد کر کے نیا نظامِ تعلیم متعارف کروانا چاہیے جو زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں کے عین مطابق ہو اور اس کے ذریعے تعلیم و تربیت جیسی اہم ضرورت بھی پوری ہو اور معاشی وسیلہ بھی بن سکے۔

دوسرا یہ کہ اسی نصاب کو برقرار رکھا جائے کہ اس نصاب کی اپنی افادیت ہے اور چونکہ روایت سے جڑا ہوا ہے اس لیے اس نصاب کی تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اور جہاں تک معاشی ضروریات کا سوال ہے تو کسی اور شعبے کو ذریعہ معاش بنانا چاہیے تاکہ دین کا کام خوش اسلوبی سے ممکن ہو سکے۔

جبکہ تیسرا مؤقف یہ ہے کہ اس نصاب کو چند ضروری تبدیلیوں کے بعد نافذ العمل کیا جائے۔

ہمارے موضوع کا تعلق اسی تیسرے موقف سے ہے۔ لیکن یہاں پھر چند سوالات جنم لیتے ہیں۔

- کیا یہ تبدیلی محض خانہ پوری اور لیپا پوتی ہے یا ایک ایسی تبدیلی ہے جو پرانے نصاب کو نئے زمانے کی ضرورتوں اور تقاضوں سے ہم آہنگ کر دے گی؟
- کیا یہ تبدیلی کرنے کے بعد نصاب اپنی کمزوریوں سے مبرا ہو جائے گا؟

- کیا یہ تبدیلی مدارس میں اصلاحات کے نام پر مدارس کے جداگانہ تشخص کو قائم رکھنے میں کامیاب ہو سکے گی یا مدارس اپنی انفرادیت کھو دیں گے؟
  - مدارسِ دینیہ کے مقاصد میں بھی تبدیلی رونما ہو گی؟
  - یا قدیم مقاصد نئے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو سکیں گے؟
- مدارسِ اسلامیہ نئے عہد کے چیلنجز سے نبرد آزما ہونے کا عزم بھی رکھتے ہیں یا قدیم روایتی انداز میں ہی عافیت سمجھتے ہیں؟

یہ سوالات جنم لیتے ہیں اور ان سوالات کے جوابات تلاش کرنا اور ان کا حل فراہم کرنا اس کتابچے کا بنیادی مقصد ہے۔

دراصل ہمارا مدعا یہ ہے کہ مدارس کا نصاب اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ چند بنیادی کمزوریوں کا حامل بھی ہے۔ ہم جب تبدیلی کا نعرہ بلند کرتے ہیں یا تبدیلی کی تحریک کا آغاز کرتے ہیں تو مقصد یہ ہوتا ہے کہ قدیم خوبیوں اور جدید تقاضوں کو ہم آہنگ کیا جائے اور تغیرِ زمانہ سے جو تبدیلیاں ناگزیر

ہیں انہیں از حد ضروری جانتے ہوئے نافذ العمل کیا جائے تاکہ مدارسِ دینیہ اپنے وجود کو برقرار رکھنے میں کامیاب ہو سکیں۔

آپ جانتے ہیں کہ زمانے میں چلن اور وجود اسی کا برقرار رہتا ہے جس کی ضرورت زمانے میں برقرار ہوتی ہے۔ جب مدارس ایک نصاب کا ملغوبہ بن جائیں گے جو نہایت ضروری تقاضوں سے صرفِ نظر کرتے ہوئے محض اپنے ہونے کا پرچار کریں گے تو پھر زمانہ اسے اپنے سینے پر بوجھ سمجھتے ہوئے دور ہٹانے کی کوشش کرے گا۔ چنانچہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ مدارس کا تشخص اور جداگانہ نظام اپنی بھرپور انفرادیت کے ساتھ قائم و دائم رہے تو پھر آپ کو اسے جدید تقاضوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح ڈھالنا ہو گا تاکہ یہاں سے قریباً ہر طرح کے صاحبان علم و فضل کی پیاس بجھ سکے اور ہر پھول و گلشن کی آبیاری ہو سکے۔

یہ وہ پس منظر ہے جس کے تناظر میں ہم مدارسِ دینیہ میں مروجہ نصاب کے متعلق چند اہم گذارشات آپ کے گوش گزار کریں گے تاکہ ان تجاویز کو مدِ نظر رکھتے ہوئے قابلِ قبول تجاویز پر عمل درآمد ہو سکے۔

مدارس کا نصابِ تعلیم، مقاصد، شرائط اور تفصیلی جائزہ

مدارس کا نصابِ تعلیم بہت ساری خوبیوں اور چند اں کمزوریوں کے ساتھ آج بھی مدارس میں رائج ہے۔ ان خوبیوں کو بر قرار رکھتے ہوئے خامیوں کو دور کرنے کی جدو جہد کرنا اس کتابچے کی تصنیف کا بنیادی مقصد ہے۔ چنانچہ ہم ذیل میں مدارس کے نصاب کے مقاصد اور شرائط ذکر کریں گے اور اس کے ساتھ مدارس میں مروجہ نصاب کا تفصیلی اور تحقیقی جائزہ لیں گے تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ کہاں کمی واقع ہے اور پھر اسے کیسے دور کیا جا سکتا ہے؟ کس شعبے کا اِضافہ درکار ہے اور کس علم یا فن کو اس سرِنو ترتیب دینے کی ضرورت ہے؟

مقاصدِ نصابِ تعلیم

مدارسِ دینیہ میں مروجہ نصابِ تعلیم چند خاص مقاصد کے تحت وجود میں آیا تھا جو قرآن کریم ہمیں عطا کرتا ہے۔ قرآن کریم کی دو آیات ہمیں نصابِ تعلیم کے مقاصد سے آگاہ کر رہی ہیں:

"فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِى الدِّيْنِ وَ لِيُنْذِرُوْا قَوْمَهُمْ اِذَا رَجَعُوْٓا اِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ۞"[1]

"تو ایسا کیوں نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے کچھ کچھ لوگ نکلتے تاکہ دین میں تفقہ (سمجھ بوجھ) حاصل کرتے اور اپنی قوم کے لوگوں کو بھی متنبہ کرتے جب کہ وہ ان کی طرف لوٹتے تاکہ وہ بھی احتیاط کرنے والے بنتے"۔

اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے تعلیم اور نصابِ تعلیم کا ایک مقصد ذکر کیا وہ ہے "تفقہ فی الدین" چنانچہ حکم دیا گیا کہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ تعلیم و تعلّم کے لیے وقف ہو اور وہ دین کی اس قدر سمجھ بوجھ پیدا کرلیں کہ دیگر لوگ جو جہاد وغیرہ میں مصروف ہوتے ہیں ان کو دین کی حدود و قیود سے آگاہ کرسکیں اور انہیں متنبہ کرسکیں۔

سورۃ النحل میں اللہ رب العالمین نے دیگر دو مقاصد کا تذکرہ کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

---

[1] (سورہ توبہ:122)

اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡهُمۡ بِالَّتِیۡ هِیَ اَحۡسَنُ ۚ[2]

"اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور ان کے ساتھ اس طریقہ سے بحث کرو جو پسندیدہ ہے"۔

چنانچہ اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے دیگر دو مقاصدِ تعلیم کا ذکر کیا۔ "تبلیغِ دین اور دفاعِ دین"۔

لہٰذا ان دو آیات کی روشنی میں ہمیں تین مقاصدِ تعلیم کا علم ہوا۔

1. تفقہ فی الدین
2. تبلیغِ دین
3. دفاعِ دین

---

[2] (سورہ النحل:125)

یعنی دین میں اتنی سمجھ بوجھ پیدا کرنا جو مسلمانوں کی ضرورتوں، مسائل اور مشکلات کو حل کرنے میں معاون ثابت ہو اور پھر اس دین کی اشاعت اور تبلیغ کے لیے کیا کیا وسائل درکار ہو سکتے ہیں اور اصول و ضوابط کیا ہیں؟ ان سے بھی آگاہی ہو سکے اور اگر کوئی دینِ اسلام کی اساسیات، قوانین، عقائد، اعمال، شعائر اور تصورات پر اعتراض کرے تو اس کو کس طرح جواب دینا ہے تاکہ اسلام کے تشخص اور وقار کی حفاظت ہو سکے۔

چنانچہ ہم مدارس میں رائج نصابِ تعلیم کا تفصیلی جائزہ لیں گے اور یہ جاننے کی کوشش کریں گے کیا یہ نصاب ان تین مقاصد کے حصول میں معاون ہے یا نہیں؟

شرائطِ تعلیم

دنیا بھر میں نصابِ تعلیم کے درست ہونے کے بہت سارے پیمانے اور کسوٹیاں متعارف کروائی گئی ہیں۔ لیکن ہم نصابِ تعلیم کو درست قرار دینے والی چار شرائط کا ذکر کریں گے تاکہ جب ہم نصابِ تعلیم کا تفصیلی جائزہ لیں

گے تو پھر اسے ان شرائط پر پرکھنے کا کام بھی کریں گے تاکہ واضح ہو سکے کہ مدارس کا نصاب اپنے مقاصد کو کس قدر حاصل کر رہا ہے اور شرائط کے پیمانے پر کس قدر پورا اتر رہا ہے؟

چنانچہ نصابِ تعلیم کے درست ہونے کی چار شرائط ہیں:

1. نصاب طلباء کے عقل و فہم کے مطابق ہو۔ یعنی ہر درجے میں طلباء کی صلاحیتوں اور فہم و شعور کو مد نظر رکھتے ہوئے ترتیب دیا جائے تاکہ طلبہ اس نصاب سے کماحقہ مستفید ہو سکیں۔
2. مقرر کردہ نصاب اپنے طے شدہ دورانیے میں مکمل بھی ہو سکے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے اور کئی کتب کے ساتھ یہ ہو بھی رہا ہے کہ ایک طویل نصاب مقرر کر دیا جاتا ہے پھر اساتذہ اور طلبہ پورے سال میں وہ ہدف پورا کرنے کی کوشش میں جت جاتے ہیں یا پھر چند ابتدائی ابحاث میں ہی سال اور دورانیہ مکمل ہو جاتا ہے۔
3. جو نصاب مقرر کیا جا رہا ہے وہ اپنے موضوع کے لئے کافی ہو۔ یہ نہ ہو کہ آپ ایک موضوع اور فن کے لیے ایک کتاب کا انتخاب

کرتے ہیں لیکن وہ اپنے نصاب کی تمام جہتوں کا احاطہ ہی نہ کر رہا ہو۔ لہٰذا نصابی مواد کا کافی ہونا بھی ضروری ہے۔

4. مرورِ زمانہ کے ساتھ تبدیلی کی گنجائش بھی موجود ہو۔ یہ طے کیا جائے کہ یہ نصاب فی الوقت موجودہ زمانے کی ضرورتوں کو مد نظر رکھتے ہوئے مقرر کیا گیا ہے۔ مستقبل میں جب ضرورت تبدیل ہو تو نصاب میں تبدیلی قابلِ مؤاخذہ نہیں ہو گی۔

چنانچہ یہ شرائط وہ بنیادی کسوٹی فراہم کرتی ہیں جن پر نصابِ تعلیم کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اگر اس معیار پر مکمل نصاب کو جانچا جائے تو پھر نتائج کو مد نظر رکھتے ہوئے حل تلاش کرنے میں سہولت ہو جائے گی۔

مدارس کے نصابِ تعلیم کا تفصیلی و تحقیقی جائزہ

مدارسِ دینیہ میں مروجہ نصابِ تعلیم ملا نظام الدینؒ کے وضع کردہ درسِ نظامی کی وہ شکل ہے جو قریب دو دہائیوں سے مختلف ترامیم اور حک و اضافے کے بعد ہمارے سامنے موجود ہے۔ درسِ نظامی کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ ملا

نظام الدینؒ نے جو نصاب مقرر کر دیا تھا تاوقتیکہ وہی نصاب ہی رائج ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ مختلف اوقات میں مختلف ترامیم کی گئیں اور چند ضروری علوم کو داخلِ نصاب کیا گیا اور چند ان فنون کو ترک کرنے میں عافیت سمجھی گئی۔

چنانچہ ہم موجودہ رائج نصاب کا جائزہ لیتے ہیں اور یہ جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ مدارس کا نصابِ تعلیم ایک جامع اور درست نصاب قرار دیا جاسکتا ہے کہ نہیں؟

بنیادی طور پر ہم مدارسِ دینیہ میں رائج نصاب کو تین بنیادی علوم میں تقسیم کرتے ہیں:

1) مذہبی واخلاقی علوم کی تعلیم
2) زبان وادب کی تعلیم
3) سماجی وعصری علوم کی تعلیم

1. مذہبی علوم کی تعلیم :

مذہبی و اخلاقی علوم دراصل درسِ نظامی میں بنیادی علوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ خاص طور پر قرآن و حدیث کا صحیح فہم حاصل کرنے اور پھر اس میں تعمق پیدا کرنے کے لیے مختلف معاون علوم کو بھی سیکھا جاتا ہے۔ اس کے لیے مختلف کتب کا تعین کیا جاتا ہے جو کہ ان علوم و فنون میں بنیادی ماٰخذ کی حیثیت رکھتی ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ جدید تقاضوں سے بھی ہم آہنگ ہوتی ہیں۔ چنانچہ اس لیے ہم ان کتب کو مختلف درجات میں طلباء کی استعداد کے لحاظ سے تقسیم کر دیتے ہیں تا کہ ان علوم و فنون کی بنیادی مصطلحات سے شناسائی ہو سکے اور پھر بعد میں تخصص کے ذریعے کسی ایک فن یا علم میں تعمق حاصل کر کے اس میں اپنی صلاحیتوں کو صرف کیا جا سکے۔

چنانچہ ذیل میں ہم مذہبی علوم میں مختلف علوم و فنون کا تفصیلی جائزہ لیتے ہیں اور جو کتب ان فنون کے لیے پڑھائی جاتی ہیں ان کا بھی تحقیقی جائزہ لیتے ہیں تا کہ یہ واضح ہو سکے کہ یہ کتاب اپنے فن کی بنیادی مصطلحات کو کس قدر جامع ہے اور اپنے فن کے لحاظ سے بنیادی معلومات فراہم کرنے میں کس قدر معاون ہے۔

تفسیر واُصولِ تفسیر:

قرآنِ مجید امتِ مسلمہ کے لیے اصل الاصول کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ وہ کتاب ہے جو مسلمانوں کے لیے بطور دستورِ حیات نازل ہوا اور رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی اسی دستور کی پیروی کرتے ہوئے ہمیں راہِ راست دکھلاتے رہے اور خود بھی اسی راستے پر گامزن رہے۔ چنانچہ ہم اگر نصاب کا جائزہ لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے درجے (ثانیہ) سے قرآن کریم کی تعلیم کا آغاز ہوتا ہے۔ اس درجے میں آخری پارہ (عم پارہ) مکمل پڑھایا جاتا ہے اور پھر تیسرے ، چوتھے اور پانچویں درجے میں بالترتیب قرآن کریم کے تین حصوں کو دس دس پاروں کی تقسیم کے ساتھ پڑھایا جاتا ہے۔ اس دورانیے میں مدرسین آزاد ہوتے ہیں کہ وہ طلبہ کو کس نہج اور طریق پر پڑھاتے ہیں۔ اس لیے ہر مدرسے میں طریقِ تدریس جدا جدا ہوتا ہے۔ جس کی وجہ سے قرآنِ کریم کے علوم کی یکساں تعلیم کا تصور فوت ہو جاتا ہے۔

اس کے بعد پھر تفسیرِ جلالین کو ایک ہی سال میں پڑھایا ہے۔ جس سے طلبہ تفسیری ذوق کو پروان چڑھانے کی ناکام کوشش کرتے ہیں۔ کیوں کہ پورا

قرآن کریم اور اس کے ساتھ تفصیلی نکات، ان کی وضاحت و تشریح، دیگر تفسیری آراء و رجحانات کی تفصیل بیان کرتے ہوئے نصاب ایک سال کے دورانیے میں مکمل نہیں ہوتا اور اگر ادارہ یہ ارادہ رکھے کہ ہم نے جلالین کی تکمیل ہر حال میں کرنی ہے تو پھر محض تکمیل ہی ہو گی تفسیر سے مناسبت یا تفسیری ذوق کی آبیاری کہیں پیچھے رہ جائے گی۔

اس کے بعد تفسیرِ بیضاوی کا بہت کم حصہ پڑھایا جاتا ہے۔یعنی محض پہلے پارے کا ربع اول نصاب کا حصہ ہے جبکہ یہ بھی تکمیل کی منزل سے بہت دور رہتا ہے۔ اس تفسیر کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ طلبہ میں بلاغی تفسیر کا ذوق پیدا کیا جائے اور ایک دوسرے اور نسبتاً نئے تفسیری رجحان یا انداز سے بھی متعارف کروایا جائے۔ لیکن بصد افسوس یہ کہنا پڑتا ہے کہ مدارس میں تفسیرِ بیضاوی کو ایک مشکل اور دقیق کتاب کے طور پر متعارف کروایا گیا ہے اور یہ رائے بھی ساتھ ہی گوش گزار کر دی جاتی ہے کہ اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے طلبہ اس تفسیر کو محض امتحانی نقطہء نگاہ سے پڑھتے ہیں۔

اگر اس کے علاوہ اصولِ تفسیر کی بات کی جائے تو اس حوالے سے دو کتب شاملِ نصاب ہیں جو کہ اپنے فن اور علم کے اعتبار سے یقیناً مکمل اور جامع ہیں۔ جیسے التبیان فی علوم القرآن، الفوز الکبیر ۔

لیکن اس باب میں ایک مسئلہ یہ ہے کہ اصولِ تفسیر کی تمام کتب آخری درجات میں پڑھائی جاتی ہیں جبکہ اس سے قبل طلبہ قرآن کریم کا ترجمہ و تفسیر بالاستیعاب اور سبقاً پڑھ چکے ہوتے ہیں۔ اگر اول درجات میں نسبتاً آسان اور سادہ اُردو زبان میں لکھی گئی ایک ایسی کتاب پڑھائی جائے جو محض اصطلاحات سے واقفیت کا سبب نہ ہو بلکہ اس میں تمرینات بھی موجود ہوں تاکہ طلبہ مشق کے ذریعے مختلف اصطلاحات کا عملی اطلاق بھی سمجھ سکیں تو یہ نسبتاً بہتری کی جانب ایک اہم قدم ہو گا۔

حدیث و اصولِ حدیث:

حدیث و اصولِ حدیث مذہبی تعلیم میں ایک بنیادی علم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام کے بنیادی مآخذ کے طور پر حدیثِ مبارکہ کی اہمیت روزِ روشن کی طرح

واضح ہے۔ علومِ حدیث کے باب میں مدارس کے اندر حدیث کی کتبِ صحاح ستہ، مؤطین یعنی مؤطا امام مالک اور مؤطا امام محمد، مشکوٰۃ المصابیح ، ریاض الصالحین، آثار السنن پڑھائی جاتی ہیں ۔ علاوہ ازیں علومِ حدیث میں اصولِ حدیث کا مقام بھی بہت اہم ہے۔ لیکن مدارس میں اصولِ حدیث کے باب میں تیسیر مصطلح الحدیث کے نام پر ایک انتہائی مختصر کتابچہ پڑھادیا جاتا ہے جبکہ بڑے جامعات میں کتبِ صحاحِ ستہ کے آغاز میں کئی اساتذہ اصولِ حدیث کی ابحاث ذکر کرتے ہیں ورنہ طلبہ کے لیے مصطلح الحدیث کے علاوہ اصولِ حدیث یا فنِ اصولِ حدیث کے باب میں کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہیں ہے جس کو پڑھ کر طلبہ یہ دعویٰ کر سکیں کہ انہوں نے فنِ اصولِ حدیث کے مبادی ابحاث پڑھ لی ہیں اب وہ تخصص کی جانب اپنی توجہ مرکوز کر سکتے ہیں۔

علومِ حدیث و اصولِ حدیث کے باب میں ہم کئی ایک کوتاہیاں برت رہے ہیں جو کہ بالترتیب درج ذیل ہیں۔

1. پہلی کوتاہی تو یہ ہے کہ کتبِ احادیث جو صحاحِ ستہ کے نام سے معروف ہیں۔ مدارس میں آخری درجے یعنی دورہ حدیث میں

پڑھائی جاتی ہیں۔ اور ظلم یہ ہے کہ ان کتب کی محض ورق گردانی کروائی جاتی ہے جبکہ طلبہ کو حدیث کے ابحاث، مسائل کے استنباط اور اشکالات وجوابات سے دور رکھتے ہوئے محض حصولِ برکت اور اختتامِ کتاب کے لیے حدیث کی تلاوت کی جاتی ہے۔ ایک طالب علم عبارت پڑھتا ہے اور اساتذہ جہاں ضروری سمجھیں وہاں دو چار باتیں بیان کر دیتے ہیں اور پھر وہی تلاوت کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

2. دوسری کوتاہی یہ برتی جاتی ہے کہ اصولِ حدیث کے نام پر درسِ نظامی میں کوئی قابلِ ذکر کتاب موجود نہیں ہے جو اصولِ حدیث کی بنیادی ابحاث کو جامع ہو۔ محض اصطلاحات کو رٹ لینا اور ازبر کر لینا فنِ اصولِ حدیث میں مہارت کو مستلزم نہیں ہے اور نہ ہی یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ ہم نے اصولِ حدیث کے باب میں اتنی معلومات فراہم کر دی ہیں کہ طلبہ کتبِ حدیث پڑھتے ہوئے اصولِ حدیث کو مدنظر رکھتے ہوئے استفادہ کر سکیں گے۔

3. تیسری کوتاہی یہ برتی جا رہی ہے کہ پچھلے کئی عشروں سے مستشرقین نے حدیث کے حوالے سے خصوصاً اشکالات و اعتراضات کا سلسلہ شروع کر رکھا ہے۔ خود مسلمانوں میں کئی ایک تحریکات نے جنم لیا جنہوں نے حدیث کی حجیت سے ہی انکار کیا اور کچھ لوگوں نے احادیث اور علومِ حدیث میں ابہام پیدا کرنے کی کوشش کی۔ کئی لوگوں نے مکمل ذخیرۂ حدیث کا انکار کیا اور بہتوں نے اخبارِ احاد کا انکار کیا اور محض اخبارِ متواترہ کے بارے میں کہا کہ وہ لائقِ استدلال ہیں۔ درحقیقت اس رجحان کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں مدارس میں علومِ حدیث کے باب میں ان اعتراضات کے جوابات کا احاطہ کرنے والی خاطر خواہ نصابی کتب کا وجود نہ ہونا ہے۔ طلبہ کی ذہنی سطح اس قدر پختہ اور مضبوط نہیں ہوتی کہ وہ منجھے ہوئے مستشرق کے اعتراض کا جواب دے سکیں اور پھر وہ طالب علم اس ذہنی کشمکش میں کبھی تشکیک کی راہوں کا مسافر بن جاتا ہے تو کبھی شدت پسندی کا کامل مظہر قرار پاتا ہے۔

4. چوتھی کوتاہی یہ برتی جاتی ہے کہ علومِ حدیث کے متعلق موجودہ زمانے میں یا اس قبل پچھلی دہائیوں میں جو اعتراضات و اشکالات سامنے آئے اور ان کا جواب دیا گیا ان کا ایک جامع تعارف بھی کتابی صورت میں موجود نہیں ہے۔ اُن تحریکات کا علم نہیں کہ جنہوں نے احادیث کے انکار کی راہ اختیار کی اور ایک وسیع حلقہء اثر پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ اور ان علماء کے بارے میں بھی طلبہ کو آگاہی نہیں ہوتی جنہوں نے ان تحریکات کا مقابلہ کیا اور احادیث کی حجیت کا دفاع کرتے ہوئے میدانِ عمل میں اتر کر ان کے اشکالات و اعتر ضات کا مؤثر جواب دیا۔

اگر ہم ان کوتاہیوں سے صرفِ نظر کرتے رہے تو ایک وقت آئے گا کہ انہی مدارسِ دینیہ سے فراغت کی سند حاصل کرنے والے افراد خود احادیث کی نکیر کرنے والوں کی صف میں موجود ہوں گے۔ لہٰذا میری تجاویز یہ ہیں کہ

- مدارس کے نصاب میں اولاً اصولِ حدیث کی جامع کتب کو شامل کیا جائے۔

- ثانیاً علومِ حدیث پر جدید اعتراضات و جوابات سے متعلق ایک کتاب شامل کی جائے جو اس موضوع پر جامع ہو۔

پھر حدیث و اصولِ حدیث کے باب میں مدارس کا نصاب کچھ اس قابل ہو جائے گا کہ طلبہ فراغت کے بعد اس شعبے میں تخصص کر کے تعمق پیدا کر سکیں اور اسے اپنی زندگی کا میدانِ عمل بنا سکیں۔

فقہ و اصولِ فقہ:

فقہ و اصولِ فقہ کے باب میں مدارس میں بحمد للہ ایک بہترین نصاب موجود ہے۔ فقہ کی کتب میں قدوری، کنز الدقائق، شرح وقایہ اور ہدایہ کے ساتھ فقہ کا ایک معتبر ترین حصہ ہمارے ہاں موجود ہے۔ اس کے ساتھ اصولِ فقہ میں اصولِ الشاشی، نور الانوار، حسامی اور التوضیح و التلویح موجود ہیں جو کہ ایک بہترین ذخیرہ ہیں۔ فقہ و اصول فقہ کے باب میں یہ کتب اور ان کا درسِ نظامی میں ایک خاص مقام ہے۔

لیکن اس کے باوجود چند ایک کمزوریاں موجود ہیں جن کی نشاندہی کرنا بہت ضروری ہے۔

1. اولاً یہ کہ فقہ کی کتابیں جو ہمارے لیے مآخذ کا درجہ رکھتی ہیں ان کتب میں مسائل کے ساتھ ایسی مثالیں موجود ہیں کہ جو موجودہ زمانے میں متروک ہو چکی ہیں۔ جن پیمانوں کا ذکر کیا جاتا ہے وہ متروک ہیں، جن باندیوں ، غلاموں کے مسائل کا تذکرہ کیا جاتا ہے وہ سب اقوامِ متحدہ کے قیام کے بعد متروک ہو چکے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی بیسیوں ایسی چیزیں آپ کو فقہ کی کتابوں میں مل جائیں گی جن کا موجودہ دور سے کوئی تعلق نہیں۔ طلبہ ان ناموں سے ، ان کی شکل و ہیئت سے واقف نہیں ہوتے۔ محض کتاب میں پڑھنا اور اپنے ذہن میں اس کی تصویر کشی کرنا، مسائل کو سمجھنے میں دقت پیدا کرتا ہے۔

لہٰذا اس صورتِ حال کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ فیصلہ صائب معلوم ہوتا ہے کہ ان کتب کو نصابی ضرورت کے تحت از سرِ نو ترتیب دیا جائے اور ان کتب سے مختلف ابواب کا انتخاب نصاب کا حصہ بنایا جائے جو متروک نہیں ہے۔ اور اس

کے ساتھ تجدید یہ کی جائے کہ مسائل کے ساتھ جدید مثالوں کا اضافہ کیا جائے۔ تاکہ طلبہ جب خالی الذہن ہو کر کتاب پڑھیں تو اول نظر میں ہی انہیں اس مسئلے کی تفہیم ہو سکے اور اس مسئلے کی مکمل تصویر ان کے دماغ کے کینوس پر تخلیق ہو سکے۔

2. دوسری کمزوری اس نصاب میں یہ پائی جاتی ہے کہ یہ کتب فقہ حنفی کی ترجمان کتب ہیں۔ ان میں مسائل فقہ حنفی کے مفتی بہ اقوال کے مطابق ہیں۔ اور جہاں دیگر مسالک کے آئمہ کا اختلاف ذکر کیا جاتا ہے تو وہاں دلائل بھی فقہ حنفی کے قوی اور مضبوط موجود ہیں۔ اس تناظر میں طلبہ جب کتبِ فقہ کی تدریس میں شریک ہوتے ہیں تو وہ ایک خاص مسلکی پسِ منظر میں رہتے ہوئے اپنے فقہی ذوق کو پروان چڑھا رہے ہوتے ہیں۔ اور پھر اساتذہ دیگر مسالک کے آئمہ کے دلائل ذکر کرنے کے بعد جس انداز میں ان کی تردید اور ردو قدح کرتے ہیں وہ طلبہ کے ذہن میں ان آئمہ کرام کی شخصیت کو کافی حد تک مجروح کر دیتا ہے۔

چنانچہ طلبہ ایک خاص مسلکی ذہن و پس منظر کے ساتھ ساتھ آئمہ کے بارے میں ایک منفی اثر کے تحت آگے بڑھتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔

لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ جہاں ہم فقہ حنفی کی معتبر کتب کی تعلیم دیتے ہیں وہیں اگر نصاب میں فقہ المقارن کو بھی شامل کر لیا جائے جس میں مختلف مسائل میں آئمہ کے اقوال، آراء اور ان کے دلائل موجود ہوں تاکہ طلبہ براہِ راست جان سکیں کہ اس خاص مسئلے میں مخالف نقطہء نظر کیا ہے اور اس کی دلیل کیا ہے؟

3۔ اصولِ فقہ میں جن کتابوں کا اوپر تذکرہ ہو چکا ہے۔ ان میں مختلف مسائل میں دلائل اور طریق استدلال کا تضاد کافی حد تک موجود ہے۔ مختلف مواقع پر کتب کی تدریس کے دوران ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اصول الشاشی میں جس مسئلے میں جو دلیل پڑھ کر آئے تھے اور جس سے حنفی استدلال مضبوط معلوم ہو رہا تھا نور الانوار میں وہی مسئلہ ہے مگر ماٰخذ تبدیل ہے اور پہلے ماٰخذ کی تردید بھی کی جارہی ہے۔

4۔ اہم بات یہ ہے کہ مختلف کتب میں اصولِ فقہ کی مختلف ابحاث اپنے اپنے مقام پر عمدگی کا ایک معیار رکھتی ہیں۔ تمام اصولِ فقہ کی کتب میں اصول و قواعد تو بنیادی طور پر ایک جیسے ہی ہیں۔

چنانچہ میری تجویز یہ کہ اولاً ان کتب کو از سر نو تعلیم اور نصاب کے لیے خاص طور پر مرتب کیا جائے اور ملخص کیا جائے۔ جن باتوں پر اعتراض ہوا ہے یا ہو چکا ہے یا ہو سکتا ہے وہ سب چیزیں کتابوں سے نکال دی جائیں اور جو بحث یا موضوع جس کتاب میں شاندار ہے اسی کتاب سے صرف وہی موضوع لیا جائے اور اس کے علاوہ دیگر موضوعات کو دوسری کتب سے تلاش کیا جائے۔ اس سے یہ فائدہ حاصل ہو گا کہ تمام ابحاث مکمل تسلی و اطمینان کے ساتھ پڑھی جائیں گی اور تمام کتب سے چنیدہ چنیدہ موضوعات پڑھنے کے بعد کتابوں سے شغف بھی بڑھ جائے گا۔

اور جہاں کہیں کوئی تضاد موجود ہے وہاں وضاحت بھی موجود ہو کہ درست مسئلہ کیا ہے اور صاحبِ کتاب کو یہاں تسامح کیوں ہوا ہے؟

اس طرح نصابِ تعلیم فقہ و اصول فقہ کا باب بھی تقریباً ہر طرح کے سقم اور کمی سے پاک ہو جائے گا۔ مدارسِ دینیہ کے طلبہ بھی فقہ میں وہ مقام حاصل کر سکیں گے جو ایک طالب علم کا خواب ہو سکتا ہے۔ اجتہاد و استنباط کی وہ قوت حاصل کر سکیں گے جس سے وہ زمانے بھر میں فقیہہ اور محقق کہلائیں گے۔

علمِ عقائد و کلام:

علمِ عقائد اور علم کلام ہمارے نصاب میں برائے نام موجود ہے۔ اس سے طلبہ کو واقفیت حاصل ہوتی ہے اور نہ ہی اس سے کما حقہ مستفید ہو سکتے ہیں۔ علم عقائد اور علم کلام کے باب میں ہم شرح عقائد، الانتباہات المفیدہ اور عقیدہ طحاویہ پڑھاتے ہیں۔ اول الذکر کتاب کا جو حصہ ایمانیات پر مشتمل ہے مدارس میں برائے نام پڑھایا جاتا ہے اور چنداں مدارس ایسے بھی موجود ہیں جہاں پہلا حصہ اس لیے چھوڑ دیا جاتا ہے کہ یہ حصہ مشکل ہے پہلے نسبتاً آسان کتاب مکمل کر لیتے ہیں اور آخر میں امتحان کی تیاری کے لیے یہ حصہ بھی پڑھ لیں گے اور شرح عقائد میں یونانی فلسفے کی بدولت پیدا ہونے والے اشکالات کا جواب دیا گیا ہے جبکہ فی زمانا اس کی افادیت سے کلی انکار تو ممکن نہیں تاہم

یونانی فلسفے کو متروک ہوئے ایک مدت گزر چکی ہے اور ہم ایک ایسی کتاب سے علمِ کلام کی پیاس بجھا رہے ہیں جو اسی یونانی فلسفے کے نتیجے میں پیدا ہونے والے اعتراضات کا جواب دیتی ہے اور وہی اندازاور اسلوب اختیار کیا گیا ہے جو یونانی فلسفے میں ہمیں عموماً دیکھنے کو ملتا ہے۔

الانتباہات المفیدہ چونکہ اردو زبان میں ایک نہایت مفید اور عالمانہ کتاب ہے تاہم دو وجوہات کی بنا اس کتاب سے استفادہ بہت کم ہوتا ہے۔ پہلی یہ کہ اس کتاب کا اسلوب، الفاظ کا انتخاب اور جملوں کی بنت و ساخت اردو کے پرانے اور مشکل لہجے اور اسلوب میں ہے جو کہ آج کل کے طلبہ کے لیے سمجھنا نہایت دشوار ہو چکا ہے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اردو زبان میں ہونے کی وجہ سے اساتذہ اس کتاب کو لائقِ اعتنا نہیں سمجھتے اور خیال کرتے ہیں کہ چونکہ یہ کتاب اردو زبان میں ہے تو طلبہ خود ہی سمجھ لیں گے اور پھر امتحان میں پاس ہونے کے لیے درکار نمبرات حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

علاوہ ازیں عقیدہ طحاویہ ایک نہایت مختصر کتابچہ ہے جو آٹھویں صدی ہجری میں لکھا گیا اور آج تک ہنوز ہم پڑھ رہے ہیں۔ ہمارے درسِ نظامی میں علمِ عقائد اور علمِ کلام جس قدر اہمیت کے حامل ہیں اسی قدر توجہ سے محروم ہیں۔

علمِ کلام کی موجودہ تصویر اور شکل پہلے کے علمِ کلام و عقائد سے بہت مختلف اور جدا ہے۔ آج کے زمانے کے لحاظ سے علمِ کلام کی تصنیف اور تشریح نہایت ضروری ہے۔ نصابِ تعلیم میں موجود علمِ کلام کی کتب قابلِ ترمیم ہیں۔ علمِ کلام اس لیے وجود میں آیا کہ فلسفے کی بدولت اسلام کے جداگانہ تشخص، اسلامی تعلیمات، ذاتِ خداوندی، حشر و نشر، جنت و دوزخ، نبوت اور وحی الٰہی وغیرہ پر فلسفیانہ اعتراضات کا جواب دے سکیں۔

بعینہ موجودہ زمانے میں الحاد و دہریت، سوشلزم، کیمونزم، نیچریت اور سائنس کے نام پر قرآن و حدیث ، اسلامی تعلیمات و نظریات اور عقائد و اخلاق غرض ہر ایک شئ پر اعتراضات کا سلسلہ شروع ہو چکا ہے اور ہنوز جاری ہے۔ چنانچہ اس زمانے میں ان جدید چیلنجز سے نبرد آزما ہونے اور اسلام کا مکمل دفاع کرنے کے لیے اس علمِ کلام جدید کی ضرورت ہے جو ان شکوک و شبہات

کو دور کرنے کا کام کر سکے۔ لہٰذا علمِ کلام جدید کے عنوان سے نئی کتب تصنیف کروائی جا سکتی ہیں تا کہ طلبہ کی صحیح نہج پر درست راہنمائی ہو سکے۔

علم الفرائض:

علم الفرائض یعنی علمِ میراث اسلامی تعلیمات و احکامات کا ایک مکمل باب ہے۔ معاشرتی زندگی اور عائلی قوانین میں علم الفرائض کی بہت اہمیت اور قدر و منزلت ہے۔ لیکن درسِ نظامی اور مدارس کے نصابِ تعلیم میں علمِ میراث کو لاوارث چھوڑ دیا گیا ہے۔ علمِ میراث میں صرف ایک کتاب سراجی پڑھائی جاتی ہے۔ جبکہ عائلی و معاشرتی زندگی میں علمِ میراث ایک مکمل موضوع کی حیثیت سے ہنوز موجود ہے۔ یہ ایک کتاب سراجی طلبہ کی ضرورت پوری کرنے سے قاصر ہے۔

اور اس کے ساتھ جدید زمانے میں جدید تقاضوں کو پورا کرنے سے بھی قاصر ہے۔ یہاں روز بروز ملکیت اور ملکیتی اصول و اشیاء تبدیل ہو رہی ہیں۔ ان میں دن بدن جدت آ رہی ہے۔ افراد کی ملکیتی اشیاء میں جدت اس حد تک آ چکی

ہے کہ خود زمانے کے تغیر میں ٹھہراؤ نہیں پیدا ہو رہا ہے۔ جیسے کمپنیوں کے حصص اور شیئرز کی بات ہو، جدید ڈیجیٹل کرنسی کی بات ہو، جدید ایسٹس کا ذکر ہو جو اپنا خارجی وجود نہیں رکھتے، آمدنی کے مختلف ذرائع اور کاروبار کی بات ہو۔ غرض جدت نے انسان کے ملکیتی اثاثوں میں بھی جدت پیدا کی ہے اور آج کے زمانے میں اثاثوں کی اقسام بیشمار پائی جاتی ہیں۔

چنانچہ صورتحال یہ ہے کہ ابھی تک ہم سراجی کو بھی مکمل سمجھنے سے قاصر ہیں جبکہ اثاثہ جات کا ایک وسیع جہاں ہمارا استقبال کرنے کے لیے موجود ہے۔

لہذا ہمیں علمِ میراث میں جدت لانے کی ازحد کوشش اور ممکنہ جہد وجہد کرنی چاہیے تاکہ طلبہ معاشرے میں موجود مسائل کا ایک قابلِ عمل حل پیش کر سکیں جو اسلامی اصولوں و معیارات کے عین مطابق ہو۔

علاوہ ازیں جدید ٹیکنالوجی کا میراث میں کیا استعمال ہو سکتا ہے؟ اس سے کیسے استفادہ کیا جا سکتا ہے؟ کن ٹولز کو استعمال کر کے میراث کے اصولوں کے مطابق درست اور قابلِ عمل حل پیش کیا جا سکتا ہے؟ ان سوالات کا جواب

جاننا اور پھر ایسے استاد کا انتخاب کرنا جو ان تمام جدید ٹیکنالوجیز اور ٹولز سے واقف ہو از حد ضروری ہے۔

علمِ میراث میں ایک اور چیز کا اضافہ بھی ہوا ہے وہ ہے جدید نظریات کے حامل افراد کا اسلام کے علمِ میراث پر اعتراضات کا ایک طویل سلسلہ۔ چنانچہ جب ہم علمِ میراث کی بات کرتے ہیں تو ہمیں طلبہ کو باور کروانا ہو گا کہ جو اعترضات مستشرقین کی جانب سے کیے جاتے ہیں ان کے حقیقی جوابات کیا ہیں؟

اور طلبہ کو علمِ میراث کے اصول و قوانین کی علمی مشق بھی کروائی جانی چاہیے تاکہ وہ عملی میدان میں اصول و قواعد کو عملاً بطور حل پیش کر سکیں۔

تجوید القرآن:

قرآن کریم کی تلاوت قواعد وضوابط کے مطابق کرنا از حد ضروری ہے۔ جہاں ہم قرآنی علوم و معارف کی بات بہت زیادہ کرتے ہیں وہیں ہم قرآن کریم کی تلاوت کی اہمیت کو بھول جاتے ہیں یا پسِ پشت ڈال دیتے ہیں۔ قرآن کریم کو

صحیح تلفظ کے ساتھ ادا کرنا ضروری ہے۔ قرآن کریم میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"ورتل القرآن ترتیلا"[3]

"اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو"

قرآن کریم کی صحیح معنوں میں قواعد کا لحاظ رکھتے ہوئے تلاوت کرنا ضروری ہے۔ لیکن ہم نے درسِ نظامی میں تجوید القرآن کے لیے محض جمال القرآن کا انتخاب کر رکھا ہے۔ وہ بھی محض امتحانی نقطہء نگاہ سے دیکھتے ہیں، کتاب کی ورق گردانی کرتے ہیں اور پھر عملاً اس مقصد کو بھول جاتے ہیں جس کے لیے فنِ تجوید وجود میں آیا۔

مدارسِ دینیہ میں جمال القرآن کی تعلیم تو موجود ہے اگر عملی مشق کا اہتمام بھی ہو جائے تو پھر یہ کمی بھی دور ہو جائے گی۔ چنداں مدارس میں باقاعدہ تجوید کلاسز کا اہتمام ہوتا ہے تاکہ طلبہ قرآن کریم کی تلاوت کر سکیں اور ماہر

---

[3] سورۃ المزمل:3

اساتذہ سے اپنے تلفظ درست کروا سکیں۔ دیگر مدارس جنہوں نے ابھی تک اس کا اہتمام نہیں کیا وہ بھی اس کا آغاز کریں تا کہ طلبہ کی یہ خامی اور کمزوری دور ہو سکے۔

اخلاقی علوم کی تعلیم:

دینی مدارس کے نصاب میں اخلاقیات اور علم الاخلاق کے باب میں کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ جبکہ اخلاقیات اسلامی تعلیمات و تہذیب کا ایک اہم اور لازمی جزو ہے۔ علومِ دینیہ کے حصول کے اسباب میں سے ایک سبب یہ بھی ہے کہ ہماری زندگیاں اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہوں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ علمِ دین کا ایک لازمی نتیجہ بھی اخلاقیات کے صورت میں بر آمد ہوتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

"انما یخشی اللہ من عبادہ العلماء"[4]

[4](فاطر:28)

"بیشک اللہ تعالیٰ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو علم رکھنے والے ہیں"

یہ آیت کریمہ ہمیں آگاہ کر رہی ہے کہ علم دین حاصل کرنے والوں اور اس میں فراغت پانے والوں میں ایک عملی نتیجہ لازماً موجود ہونا چاہیے کہ وہ اللہ سے ڈرنے والے ہوں۔ خشیت الٰہی ان کے دلوں میں جاگزیں ہو۔ کیا آپ جانتے ہیں کہ محض کلامی و فقہی ابحاث، اصولی و فروعی اختلافات کو ازبر کر لینے سے ہمارے دلوں میں خشیت الٰہی پیدا ہو جائے گی؟ کیا ہم ان علمی موضوعات میں تعمق پیدا کریں گے تو خشیت الٰہی خود بخود پیدا ہو جائے گی؟ اس کے لیے کسی اور علم، فن یا چیز کی ضرورت نہیں ہے؟

یقیناً ضرورت ہے اور وہ ہے "علم الاخلاق اور اخلاقیات" کی۔ یہ علم ہمیں اخلاقی قدروں سے آگاہ کرتا ہے اور ہمیں یہ باور کرواتا ہے کہ ہم نے ماڈرن

اتج اور جدید دنیامیں مسلم تہذیبی شناخت کے ساتھ اپنے وجود کو کیسے بر قرار اور قائم رکھنا ہے؟

لیکن اگر درس نظامی میں نصابِ تعلیم کا جائزہ لیں تو معلوم ہو گا کہ علم الاخلاق کی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔ یہاں تک کہ سیرت النبی ﷺ کے متعلق بھی کوئی کتاب موجود نہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے اخلاق و اعمال و سنن کو بیان کرنے والی کوئی کتاب موجود نہیں ہے۔

ہماری تجویز یہ ہے کہ جدید علم الاخلاق کو اگر رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ سے استنباط کر کے اس طرح ایک کتاب مرتب کی جائے کہ اس میں علم الاخلاق کے بنیادی اصول و ضوابط کا تذکرہ ہو اور مثالوں میں رسالت مآب ﷺ کی زندگی اور سیرت کو بیان کیا جائے۔ تو یوں ہمیں دو مقاصد حاصل ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ ہم علم الاخلاق سے واقف ہوں جائیں گے دنیا بھر میں اخلاقیات کے نام پر جو کچھ ہم پر تھوپا جاتا ہے ہم اس سے نکلنے اور بچنے میں کامیاب ہو جائیں گے اور دوسرا یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی سیرتِ طیبہ کا ایک پہلو ہمارے سامنے موجود ہو گا کہ ہم نے اپنی عملی زندگی میں آپ کی سیرت

اور سنت سے مسائل کو کیسے اخذ کرنا ہے اور انہیں عملاً اپنی زندگی کا جزوِ لاینفک کیسے بنانا ہے؟۔ اگر اس موضوع پر ایک جامع کتاب ترتیب دی جائے تو یقیناً طلبہ کی تعلیم وتربیت دونوں کے لیے یہ کتاب مفید و معاون ثابت ہو گی۔

2. زبان وادب کی تعلیم:

عربی زبان وادب:

لسانیات اور ادبیات کے باب میں ہمارے دامن میں صرف عربی زبان و ادب کا مواد موجود ہے۔ صرف و نحو اور بلاغت وغیرہ بنیادی علم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ عربی زبان و ادب میں نثر و نظم دونوں کے مجموعے پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن ان میں بھی کئی اہم خامیاں موجود ہیں جو عربی ادب کی افادیت کو بہت کم کر دیتی ہیں۔

پہلی خامی تو یہ ہے کہ یہ کتب قدیم اسلوب میں لکھی گئی ایسی کتب ہیں جن میں پیچیدہ اور مشکل تراکیب موجود ہیں۔ عموماً اس خیال سے انہیں داخلِ نصاب کیا گیا تاکہ اُس طرزِ تحریر کو سمجھنے میں مدد ملے گی جو اسلام کے ابتدائی زمانے

میں موجود تھا۔ لیکن اگر آپ نے عربی زبان و ادب اور اسلامی کتب کا مطالعہ کیا ہو تو معلوم ہو گا کہ دونوں کے طرزِ تکلم اور طرزِ تحریر اور اختیار کردہ تراکیب میں بہت واضح فرق ہے۔ اسلامی کتب میں عموماً ایسی زبان استعمال کی جاتی ہے جو نہایت آسان فہم اور مشکل و پیچیدہ تراکیب سے مبرا ہے۔

ان قدیم ادبی کتب کا نقصان یہ بھی ہوتا ہے کہ طلبہ آٹھ سال تک یہ ہی سمجھتے ہیں کہ عربی ادب اسی طرح کی تراکیب اختیار کرنے اور اسی اسلوب میں ڈھالے گئے ادب کا مجموعہ ہے جبکہ ماڈرن ایج میں اس اسلوب اور طرزِ نگارش کا دور دور تک کوئی واسطہ نہیں ہے۔

لہذا اگر ان کتب کو خارجِ نصاب کرنا ممکن نہ بھی ہو تو جدید عربی ادب سے ایک ایسی کتاب کا انتخاب ضرور ہونا چاہیے جو جدید عربی سے شناسائی پیدا کرنے میں معاون ثابت ہو۔ اور پھر موجودہ زمانے کی عربی زبان سے واقفیت پیدا کرنے میں معاون بھی ہو خصوصاً صحافتی زبان و بیان کو سمجھنے میں ممد و معاون ہو تو طلبہ کو عملی اور پیشہ ورانہ زندگی میں بہت مدد مل سکتی ہے۔

اس کے ساتھ ساتھ مدارس کے نصاب میں صرف و نحو اور بلاغت کے لیے بہترین کتب داخلِ نصاب ہیں۔ جو یقیناً عربی زبان سیکھنے میں کافی ممد و معاون ثابت ہوتی ہیں۔ لیکن مدارس میں نصاب تو موجود ہے مگر نصاب کو طلبہ تک پہنچانے کا طریقہ موجود نہیں ہے۔ مدارس میں اساتذہ کی تربیت اس نہج پر نہیں کی جاتی کہ وہ طلبہ کو صرف و نحو اور بلاغت کی تعلیم دے سکیں۔ عموماً یوں ہوتا ہے کہ سب سے کمزور استعداد رکھنے والے استاد کو صرف و نحو کی جماعت تھمادی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس جماعت میں مبتدی طلبہ ہوتے ہیں جو زیادہ علمی اپروچ نہیں رکھتے۔ چنانچہ انہیں مطمئن کرنا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

لیکن اس سارے معرکے میں نقصان محض طالب علم کا ہوتا ہے۔ آٹھ سال عربی زبان و ادب پڑھنے کے باوجود مدارسِ دینیہ کا طالب علم عربی تحریر و تکلم سے نابلد ہوتا ہے۔ وہ عربی بول سکتا ہے اور نہ ہی لکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کی ایک ہی وجہ تو یہ ہے کہ ہم عربی ادب کو ایک امتحانی نقطہء نظر سے دیکھتے ہیں جبکہ وہ ایک مستقل جانفشانی کے ساتھ سیکھنے والا علم ہے۔ اگر اس کی

عملی مشق کا اہتمام نہ ہو تو طلبہ آٹھ سال پڑھنے کے باوجود عربی زبان و ادب سے شناسائی پیدا کرنے میں ناکام رہیں گے۔

ابتدائی درجات میں عربی زبان کے آزادنہ تکلم کا اہتمام بھی ہونا چاہیے۔ آزادنہ تکلم کی شرط اس لیے ہے کہ اگر طلبہ ابتدائی درجات میں قواعد و ضوابط کی گنتی میں پھنسے رہیں گے تو وہ آگے بڑھنے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ یہاں ضرورت اس امر کی ہے کہ فی الوقت طلبہ کو عربی تکلم پر عبور حاصل کرنا ہے تاکہ وہ عربی زبان سے کلام کی حد تک مانوس ہو سکیں۔

اس کے بعد عربی تحریر کی عملی مشق ایک نہایت ضروری تقاضا ہے۔ درسِ نظامی کے نصاب میں اس کی ضروری کتاب معلم الانشاء موجود ہے مگر اداروں کو اس کا اہتمام کرنے کی ضرورت ہے۔ محض قوانین کو رٹ لینا اور ان کی تمرینات کو حل نہ کرنا اس کتاب کے بنیادی مقصد کو فوت کر دیتا ہے۔ اس طرح خارجی مطالعہ میں جدید عربی کتب کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجات کے عربی اخبارات کا انتظام بھی ہو تاکہ انہیں مروج عربی زبان (جو لکھی ، سمجھی اور بولی جارہی ہے) اس سے واقفیت ہو سکے۔

اُردو وانگریزی زبان وادب:

لسانیات کے باب میں مدارس کے اندر محض عربی زبان کی تعلیم کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ اردو اور انگریزی زبان و ادب کو بالکل بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا۔ جبکہ ان دونوں زبانوں کی فی زماننا بہت اہمیت وافادیت ہے۔

جنوبی ایشیا کے ممالک میں خصوصاً رابطے کی سب سے بڑی زبان اردو ہے۔ چنانچہ ہمارے ملک میں خصوصاً اور ہندوستان، افغانستان، بنگلہ دیش، ایران وغیرہ میں عموماً اردو زبان سمجھی اور بولی جاتی ہے۔ اس کے علاوہ ایشیائی نژاد جہاں کہیں دنیا بھر میں موجود ہیں وہ اُردو زبان و ادب کے فروغ کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔ چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں دنیا بھر کے مسلمانوں میں اُردو بھی ایک رابطے کی زبان ہے۔

اُردو زبان میں تحریری ملکہ پیدا کرنے کے لیے مدارس میں نصابی سرگرمیوں کا آغاز ہونا چاہیے۔ تاکہ طلبہ اردو زبان کو اچھی طرح لکھنے اور بولنے کے قابل ہو جائیں۔

علاوہ ازیں انگریزی زبان دنیا بھر میں رابطے کی زبان ہے۔ جب برصغیر میں مسلمانوں کا دورِ اقتدار تھا تو اس وقت مدارسِ دینیہ میں فارسی زبان نصاب میں پڑھائی جاتی تھی جبکہ یہاں کے باشندوں کی مادری اور رابطے کی زبان فارسی نہ تھی۔ لیکن فارسی زبان کو داخلِ نصاب کرنے کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت کی سرکاری اور دفتری زبان فارسی تھی۔ چنانچہ اس وقت کے علماء فارسی زبان میں عبور حاصل کرتے اور پھر سول سروس میں اپنی خدمات انجام دیتے۔

اگرچہ اس وقت پاکستان میں قومی و رابطے کی زبان اُردو ہے مگر عدالتی و دفتری زبان انگریزی ہے۔ چنانچہ اگر ہم اس موجودہ نظم میں اپنی پہچان یا جگہ بنانے کی کوشش کرتے ہیں تو پھر ہمیں ان دونوں زبانوں کو سیکھنا اور سمجھنا ہو گا اور پھر ان میں عبور حاصل کرنا ہو گا۔

علاوہ ازیں دنیا بھر میں اگر ہم اشاعتِ دین کا خواب دیکھتے ہیں یا اس کی افادیت کو سمجھتے ہیں یا دنیا بھر میں اسلام کی دعوت و پیغام پہنچانا چاہتے ہیں تو پھر ہمیں انگریزی زبان کو سیکھنا اور سمجھنا ہو گا۔

لہٰذا میری تجویز یہ ہے کہ اُردو اور انگریزی کو مدارسِ دینیہ میں نصاب کا حصہ بنایا جائے۔ انگریزی زبان ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ درجات تک اس طرح پڑھائی جائے کہ جب طلبہ مدارسِ دینیہ سے فراغت حاصل کریں تو وہ عربی ، اردو اور انگریزی زبانوں کے ماہر کے طور پر معاشرے میں قدم رکھیں۔

3. سماجی و عصری علوم کی تعلیم:

سماجی و عصری علوم کے باب میں مدارس کے نصاب میں کوئی ایک کتاب بھی موجود نہیں ہے۔ ایک ایسی کتاب جو کسی ایک عصری یا سماجی علم کے تعارف اور مصطلحات کے طور پر موجود ہو۔

جبکہ آپ جانتے ہیں کہ مدارسِ دینیہ میں عصری و غیر عصری یا سماجی و غیر سماجی علوم کی کوئی تقسیم سرے سے موجود ہی نہیں تھی۔ جب انگریز سامراج نے برصغیر پر قبضہ کیا تو مسلمانوں کی تہذیب و تمدن اور معاشرت و ثقافت کے جداگانہ تشخص و نظم کو ختم کرنے کے لیے مسلمانوں کو تعلیمی شعبے میں ایسی

تبدیلیاں کرنے پر مجبور کیا جنہوں نے مسٹر و ملا کی تقسیم کی بنیاد رکھی۔ معاشرے کو ایک ایسے دوراہے پر لا کھڑا کیا جہاں سے لوگ دین و دنیا کی جداگانہ حیثیت کے بارے میں متشوش دکھائی دیں۔ حالانکہ یہ مدارسِ دینیہ ہی تھے کہ جہاں ایک ہی ادارے سے ایک ہی نصاب پڑھنے والے طالب علموں میں معروف ریاضی دان اور شاعر عمر خیام پیدا ہوئے اور وہیں سے ان کے ہم سبق وزیر باتدبیر وزیراعظم شاہِ سلجوق نظام الملک طوسی بھی نکلے۔ یہ مدارسِ دینیہ کے نصابِ تعلیم کا کمال تھا جو اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ موجود تھا جو ہر ایک کو دینی و عصری علوم کی یکساں تعلیم دیتا تھا۔

مگر آج ہم نے اس تقسیم کو اس قدر دل و جان سے قبول کیا ہے کہ اسے کسی صورت بھی رد کرنے کے روادار نہیں۔ چنداں ایسے ضروری مضامین ہیں کہ جن کے بغیر اسلامی تعلیمات و احکامات کی تکمیل بھی نہیں ہوتی لیکن ہم نے ان نہایت ضروری مضامین اور علوم کو بھی درخورِ اعتنا نہیں سمجھا۔ ہم ذیل میں ان علوم کو دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں تاکہ ہمیں فیصلہ سازی میں آسانی اور سہولت ہو:

پہلے حصے ان علوم کا تذکرہ ہے جو نسبتاً زیادہ ضروری ہیں جن کے بغیر مذہبی علوم کی تکمیل بھی کامل نہیں۔ جو طلبہ اور مدارس کے فاضلین کے لیے ایک لازمی جزو کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً

- معاشیات
- سیاسیات
- قومی و بین الاقوامی قانون
- تاریخِ اسلام

یہ چار علوم ایسے ضروری ہیں کہ ان کے بغیر اسلامی و مذہبی علوم کی تکمیل کا تصور ادھورا ہے۔ ہم ذیل میں ان کی افادیت سے متعلق مختصراً چند گذارشات پیش کرتے ہیں تا کہ ان علوم کی اہمیت و ضرورت کے متعلق ہمارے رجحانات میں تبدیلی در آئے۔

معاشیات دنیا بھر میں ایک لازمی علم کی حیثیت رکھتا ہے۔ معیشت و اقتصاد کے بارے میں دنیا بھر میں روز بروز نئی نئی ایجادات ہو رہی ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ پھر چند عشروں میں ایک نئے علم نے اپنی جگہ بنانا شروع کی اور آج

عصری علوم سے کہیں بڑھ کر مذہبی علوم میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ وہ علم ہے "اسلامی معیشت و اقتصاد"۔

اسلامی معیشت و اقتصاد وہ علم ہے کہ جس کی فی زماننا کئی جہتیں موجود ہیں۔ جدید دنیا میں اقتصاد کے عنوان پر جدت آئی تو کمپنیاں قائم ہوئیں اور پھر ان کمپنیوں کو عام لوگوں تک رسائی دینے کے لیے سٹاکس و حصص کا نظام وجود میں آیا۔ پھر یوں ہر ملک میں سٹاکس اور حصص کی ایک نئی مارکیٹ وجود میں آئی۔ اب ماہرین اسلامی معشیت و تجارت نے اس کے لیے اسلامی اصول و ضوابط وضع کیے اور وہ شرائط متعارف کروائیں کہ جن پر کمپنیوں کو پرکھنے کے بعد آپ ان میں حصہ دار بن سکتے ہیں۔ اسی طرح کرنسی کی دنیا میں انقلاب برپا ہوا اور ڈیجیٹل کرنسی نے اپنا لوہا منوایا۔ دنیا بھر کے ممالک اپنے قوانین میں ڈیجیٹل کرنسی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے دن رات کام کر رہے ہیں اور پاکستان میں بھی اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ایک کمیٹی تشکیل دی گئی جس کا کام یہ ہے کہ وہ ڈیجیٹل کرنسی کے لیے ایک ایسا جامع ضابطہ اور

چارٹر آف ڈیجیٹل کرنسی مرتب کرے جو آئندہ زمانے میں لوگوں کے لیے ایک رہنما کے طور پر موجود ہو۔

لیکن اس ضرورت کے ساتھ اسلامی معیشت کے ماہرین بھی میدان عمل میں آئے اور انہوں نے ان ضرورتوں کو عمیق نظری سے دیکھا اور پھر ان کے لیے اسلامی قوانین کو کھنگالنے کی کوشش کر رہے ہیں تاکہ وہ قوانین متعارف کروائیں جائیں جو اسلامی تعلیمات سے اخذ کردہ ہوں۔

چنانچہ مدارسِ دینیہ میں معاشیات اور اسلامی معشیت و تجارت کے متعلق کتب داخلِ نصاب کرنے کی اشد ضرورت ہے تاکہ طلبہ جب مدارس سے فراغت کے بعد معاشرے میں نکلیں تو اس وقت انہیں جن مسائل کا سامنا ہو تو پھر اس وقت شرمندگی اٹھانے یا غلط جواب دینے کے بجائے وہ صحیح اور درست راہنمائی کر سکیں۔

اس کے بعد علومِ سیاسیات کا نام ہے۔ اس وقت دنیا بھر میں سیاست میں علماء اور دینی پس منظر رکھنے والے لوگوں کی اشد ضرورت ہے۔ جہاں کہیں علماء کا کردار سیاست کے باب میں نظر آتا ہے تو وہ روایتی سیاست کے لباس میں نظر

آتا ہے۔ جبکہ جدید دنیا میں سیاسیات یا پولیٹکل سائنس کے نام سے ایک مستقل علم کی بنیاد اور داغ بیل ڈال دی گئی ہے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ علومِ سیاسیات میں اسلامی تعلیمات کے مطابق ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جو جدید علمِ سیاست کا پورا حق ادا کرے اور اسلامی تعلیمات و احکامات میں موجود سیاسی قوانین کا بھی ایک جامع نصاب مرتب ہو تاکہ طلبہ کو جدید و قدیم کا ایک ایسا امتزاج میسر آئے جو ان کے لیے عملی سیاست میں قدم رکھنے میں معاون ثابت ہو۔

تیسرے درجے میں قومی و بین الاقوامی قوانین کا علم ہے۔ جس ملک کے ہم باسی اور شہری ہیں اس ملک کے قوانین کے متعلق ہمیں کسی چیز کا علم نہیں ہوتا۔ جب ایک تعلیم یافتہ فرد ہی ملکی قوانین سے نابلد ہو گا تو وہ کیسے محبِ وطن شہری بن سکے گا؟ اور اسی طرح بین الاقوامی قوانین کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔

دنیا بھر میں رائج قوانین اور خصوصاً بین الاقوامی قوانین نے اسلامی تعلیمات و نظریات پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ مسلمانوں کے نظریات اور اسلام مخالف افراد

کے اعتراضات میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئی ہیں۔ آپ یوں کہیں کہ بین الاقوامی قوانین نے دیکھنے، سننے، سمجھنے اور پرکھنے کے زاویے تبدیل کر دیے ہیں۔ چنانچہ ان قوانین کا اثر ہماری تعلیمات پر کیا ہوا ہے؟ وہ قوانین کیا ہیں؟ ہم اس دنیا کے فرد ہونے کی حیثیت سے اس سے کس طرح معاملہ کر سکتے ہیں ؟ یہ سب جاننے کے لیے ہمیں ان بین الاقوامی قوانین کا علم ہونا ضروری ہے۔

چوتھے درجے میں تاریخِ اسلام ہے۔ اسلامی تاریخ بہت سارے عروج و زوال اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اسلامی تاریخ کا علم بھی نہایت ضروری ہے تاکہ ہمیں اپنے ورثے کی پہچان ہو سکے اور جب پہچان ہو جائے گی تو یقیناً حفاظت کی رمز بھی پیدا ہو گی۔ چنانچہ کم از کم ایک کتاب نصاب میں تاریخ اسلام سے متعلق موجود ہونی چاہیے۔ میری رائے یہ ہے کہ مولانا اکبر شاہ نجیب آبادی کی کتاب "تاریخ اسلام" داخلِ نصاب ہونی چاہیے جو مختصر ہونے کے ساتھ ساتھ جامع اور مکمل تاریخ بھی ہے۔ آپ جانتے ہیں "جو قوم اپنی

تاریخ بھولا دیتی ہے وہ در حقیقت اپنا وجود بھولا دیتی ہے" آپ اپنے وجود کو اس وقت بر قرار رکھ سکتے ہیں جب آپ کو اپنی تاریخ کا علم ہو۔

چنانچہ یہ چار علوم ایسے بنیادی اور ضروری علوم ہیں کہ جن کے بغیر اسلامی تعلیمات کا نصاب ادھورا اور ناکافی معلوم ہوتا ہے۔

اب ہم ان پانچ علوم و فنون کا جائزہ لیتے ہیں جو اسلامی تعلیمات کے نصاب کی تکمیل کے لیے ضروری تو ہیں مگر اس درجے میں نہیں جہاں پہلے چار علوم کو رکھا گیا۔ وہ پانچ علوم درج ذیل ہیں:

- تاریخِ اقوامِ عالم
- جغرافیہ
- حساب
- حفظانِ صحت
- جنرل سائنس

تاریخِ اقوامِ عالم کا علم ہونا اس لیے ضروری ہے تا کہ مختلف قوموں کے حال احوال سے قدرت کے نظامِ عالم کا علم ہو سکے۔ جب آپ قوموں کی تاریخ کا

مطالعہ کرتے ہیں تو آپ کئی اسباق اپنے اندر انڈیل لیتے ہیں۔ کس قوم نے کیا غلطی کی کہ وہ زوال پذیر ہو گئے ؟ کس قوم نے ترقی کے لیے کن راہوں کا انتخاب کیا تو وہ ترقی یافتہ کہلائے؟ کس قوم نے کن برائیوں سے صرفِ نظر نہ کیا؟ اور کس قوم نے کن قوانین کا پاس کیا؟

یہ سارے سوالات اور ان کے جوابات ہمیں ان غلطیوں سے دور اور باز رکھتے ہیں جو ان قوموں نے برتیں۔

اس کے بعد جغرافیہ کا علم ہے۔ اس وقت یقیناً دنیا بھر میں جغرافیائی علم میں دن بدن جدت آ رہی ہے۔ نئے نئے آلات ایجاد ہو رہے ہیں۔ اس لیے علم جغرافیہ کا جدید ترین ورژن طلبہ کو پڑھانے کی ضرورت ہے تا کہ وہ دنیا کے نقشے پر بسنے والے ممالک کی سرحدات وغیرہ کو جان سکیں۔

علمِ حساب مدارسِ دینیہ کے طلبہ کے لیے نہایت ضروری ہے۔ جب ہم مذہبی علوم میں علم الفرائض پڑھتے ہیں تو اس وقت حساب کا بنیادی علم ہونا ضروری ہے۔ اگر طلبہ علمِ میراث پڑھنے سے قبل حساب کا بنیادی علم رکھتے ہوں تو اس وقت انہیں میراث کے اصول وضوابط بآسانی سمجھ آ جائیں گے۔

حفظانِ صحت کی بنیادی معلومات بھی نہایت ضروری ہیں۔ جیسے فرسٹ ایڈ کیسے دی جاتی ہے؟ چھوٹی موٹی بیماریوں کے لیے کون کون سی ادویات استعمال کی جاتی ہیں؟ اپنی ذاتی زندگی کو بہتر بنانے کے لیے حفظانِ صحت کے کن اصولوں کی پاسداری کرنا نہایت ضروری ہے؟ اس طرح کے دیگر بنیادی حفظانِ صحت کے اصولوں سے آگاہی کافی ہو سکتی ہے۔ طلبہ کو ہفتے میں ایک دن یا ہر ماہ میں چار دن کم از کم حفظانِ صحت کے اصولوں کی تعلیم دینا نہایت ضروری ہے۔

آخر میں جنرل سائنس ایک ایسا علم ہے جس سے مدارسِ دینیہ کے طلبہ ذرا برابر بھی مانوس نہیں ہوتے۔ سائنس میں مہارت تو بہت مشکل ہے مگر بنیادی سائنسی معلومات اور سائنسی ایجادات سے متعلق طلبہ کو بنیادی تعلیم فراہم کرنا نہایت ضروری ہے۔

یہاں تک ہم نے مدارس میں رائج نصابِ تعلیم کے تینوں حصوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ مناسب تجاویز بھی دی ہیں تاکہ وہ ان غلطیوں کی نشاندہی کرنے کے بعد ان کے حل کی طرف متوجہ ہو سکیں۔

علمی و فکری تناظر میں تجزیہ

کتابچے کے آغاز میں ہم نے مدارسِ دینیہ میں پڑھائے جانے والے نصاب کے مقاصد کا ذکر کیا تھا۔ اب جبکہ نصابِ تعلیم کا تفصیلی و تحقیقی تجزیہ کر چکے ہیں تو ایک طائرانہ اور ناقدانہ نگاہ بھی تمام نصاب پر ڈال لی جائے تاکہ واضح ہو سکے کہ مروجہ نصابِ تعلیم اپنے مقاصدِ تعلیم کے حصول میں کس قدر معاون ہے؟

جیسا کہ پہلے ذکر کر چکے ہیں کہ مقاصدِ تعلیم تین ہیں:

1. تفقہ فی الدین
2. تبلیغِ دین
3. دفاعِ دین

جب ہم نصابِ تعلیم کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے مذہبی علوم میں تفسیر و اصولِ تفسیر، حدیث و اصولِ حدیث اور فقہ و اصول فقہ بنیادی طور پر ایک

جامع نصاب کے ساتھ موجود ہیں۔ جبکہ حدیث و اصولِ حدیث کے باب میں نصاب کے اندر کمزوریاں زیادہ پائی جاتی ہیں تاہم مجموعی طور پر ایک شاندار اور لائق صد تحسین نصاب موجود ہے جو تفقہ فی الدین کے مقصد کو پورا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

اگر اس کے ساتھ ہماری تجاویز پر غور کیا جائے اور انہیں عمل میں لایا جائے تو یقیناً یہ نصاب ایک بہترین اور جاندار نصابِ تعلیم کہلائے گا۔

جبکہ دوسرا مقصد تبلیغِ دین سرے سے نصاب سے اخذ ہی نہیں ہوتا۔ کیوں کہ تبلیغِ دین کے حوالے سے اصول و ضوابط کی کوئی مستقل کتاب موجود نہیں ہے جہاں سے تبلیغ و اشاعت دین کا تفصیلی خاکہ اور اسلامی احکام و آدابِ دعوت کا علم ہو سکے۔ تبلیغِ دین و اشاعتِ دین (جو کہ اسلام کی بنیادی ضرورتوں اور نصاب کے بنیادی مقاصد میں سے ایک ہے) کا لحاظ کرنا اور انہیں داخلِ نصاب کرنا از حد ضروری ہے۔ مدارسِ دینیہ کے سنجیدہ اصحابِ فکر کو اس مقصد کے حصول کے لیے کوئی ایسی کتاب داخلِ نصاب ضرور کرنی چاہیے جو تبلیغ کے مکمل اصول و آداب کا احاطہ کرتی ہو۔

اور تیسرا مقصد یعنی دفاعِ دین کا دسواں حصہ بھی نصاب سے حاصل ہونے کا امکان بھی نہیں ہے۔ کیوں کہ ہم نے نصاب میں علمِ عقائد و علمِ کلام کو درخورِ اعتنا ہی نہیں سمجھا جبکہ جدید دنیا میں علمِ کلام کی ایسی نئ صورتیں پائی جاتی ہیں جن سے تعارف ہو تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے کسی اجنبی دنیا سے شناسائی ہوئی ہو۔ فتنہء قادیانیت کے حوالے سے ایک کتاب "آئینہ قادیانیت" کے نام سے وفاق المدارس العربیہ پاکستان کے نصاب کا حصہ ضرور ہے مگر دیگر محاذ ایسے ہیں جن کے بارے میں نصابی کتب کا ہونا از حد ضروری ہے۔

سوشلزم، کمیونزم، نیچریت، لادینیت و دہریت وغیرہ ایسے نظریات ہیں جو اب خود مذاہب کی شکل اختیار کر رہے ہیں۔ جبکہ ہمارے طلبہ ان عنوانات سے ہی بے خبر ہوتے ہیں۔

چنانچہ نصابِ تعلیم میں دوسرے دو مقاصد کا حصول تو تقریباً ناپید ہے۔ ہمیں از خود سوچنا چاہیے کہ قرآن کریم نے جو مقاصدِ تعلیم ہمیں عطا کیے ہم وہ مقاصد حاصل کرنے میں ناکام ہو رہے ہیں تو کیسے دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم دینی مدارس میں دینی تعلیم کی تکمیل کا فریضہ انجام دیتے ہیں۔

مستقبل کی سمت اور تجاویز

مدارسِ دینیہ کا مستقبل کیا ہے؟ موجودہ دور کا سب سے اہم سوال ہے۔ اس سوال کا صحیح جواب تو تاریخ طے کرے گی مگر ایک ضروری اور اہم بات یہاں ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

مدارس میں مروجہ تعلیمی نصاب ایک ایسی ضرورت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ جب تک ضرورت باقی رہے گی مدارسِ دینیہ کا وجود باقی رہے گا۔ مسلمان جب تک اس دنیا میں وجود رکھتے ہیں اس وقت تک مدارسِ دینیہ کا مستقبل محفوظ ہے۔

مگر محض وجود ہونا کافی نہیں بلکہ ایک ایسا وجود درکار ہے جو اسلام کے مطلوب مقاصدِ تعلیم کو اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ مکمل کرے۔ ایسا نصاب رائج ہو جو تفقہ فی الدّین کا ملکہ بھی پیدا کرے تو تبلیغِ اسلام کے آداب و اصول بھی سکھائے اور اگر کبھی اسلام پر کوئی نظریاتی حملہ کرے تو دلائل و براہین کے

وار سے اس کے ہر ہر حملے کا بھرپور جواب دے۔ یوں پھر مدارس اسلام کے حقیقی قلعے کہلائیں گے۔

چنانچہ مدارس اگر محض ضرورت پوری کرنے کی غرض سے قائم رہیں گے تو دینی تعلیم کے مقاصد کا حصول ممکن نہیں ہو سکے گا اور اس حال میں اپنا تسلسل جاری رکھیں گے تو ایک ناقص کارکردگی کا مظاہرہ کریں گے کیوں کہ وہ ان مقاصد کو حاصل کرنے کی تگ و دو نہیں کر رہے جو قرآن کریم ہمیں مقاصدِ تعلیم کے عنوان سے فراہم کرتا ہے۔

ہم مدارسِ دینیہ کے مروجہ نصابِ تعلیم کے جائزے کے بعد جن نتائج تک پہنچے ہیں ان کا ذکر تو پہلے گذر چکا تاہم اس وقت ذیل میں چند اہم تجاویز پیش کر رہے ہیں تاکہ جب بھی نصاب کی تبدیلی یا صحت کا سوال ہو تو ہماری تجاویز بھی زیر غور لائی جا سکیں۔

- اولاً قرآن کریم کی تفہیم کے لیے تفسیر و اصولِ تفسیر کے باب کو مکمل کرنا ہو گا۔ کیوں کہ دینی تعلیم سے مقصود یہ ہی ہے کہ قرآن مجید کی صحیح تعلیم تک رسائی ہو سکے۔

- ثانیاً کتب احادیث کی تقسیم کا خاص طریق کار متعین کرنا ہو گا۔ کیوں کہ اس طرح صحاحِ ستہ کی تعلیم دینا محض ورق گردانی اور تلاوت ہی ہے۔ مقصود و مطلوب یہ ہے کہ احادیث کے باب میں اہم وضروری ابحاث کو سمجھا جائے اور ان کا علم حاصل کیا جائے۔ اس کے علاوہ حجیت حدیث، حدیث پر جدید اعتراضات، مستشرقین کے اشکالات وغیرہ پر مستقلاً ایک ایسی جامع کتاب شاملِ نصاب کی جائے جو تمام ابحاث کا مکمل احاطہ کرتی ہو۔
- فقہ کی کتب کو از سرِ نو ترتیب دیا جائے۔ غیر ضروری ابحاث اور ابواب کو نکالا جائے اور ضروری مباحث کو شاملِ کتاب کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ مثالوں کو از سرِ نو شامل کیا جائے تاکہ طلبہ کتاب پڑھتے وقت حاضر میں رہتے ہوئے مسائل کو سمجھیں۔ یہ نہ ہو کہ طالب علم کو مسائل سمجھنے کے لیے چند صدیاں قبل کا سفر طے کرنا پڑے۔
- علم عقائد و علم کلام پر خصوصی توجہ دی جائے کیوں کہ یہ دفاع دین کا مستقل حصہ ہے۔ جدید علم کلام اور قدیم علم کلام کے امتزاج کے ساتھ

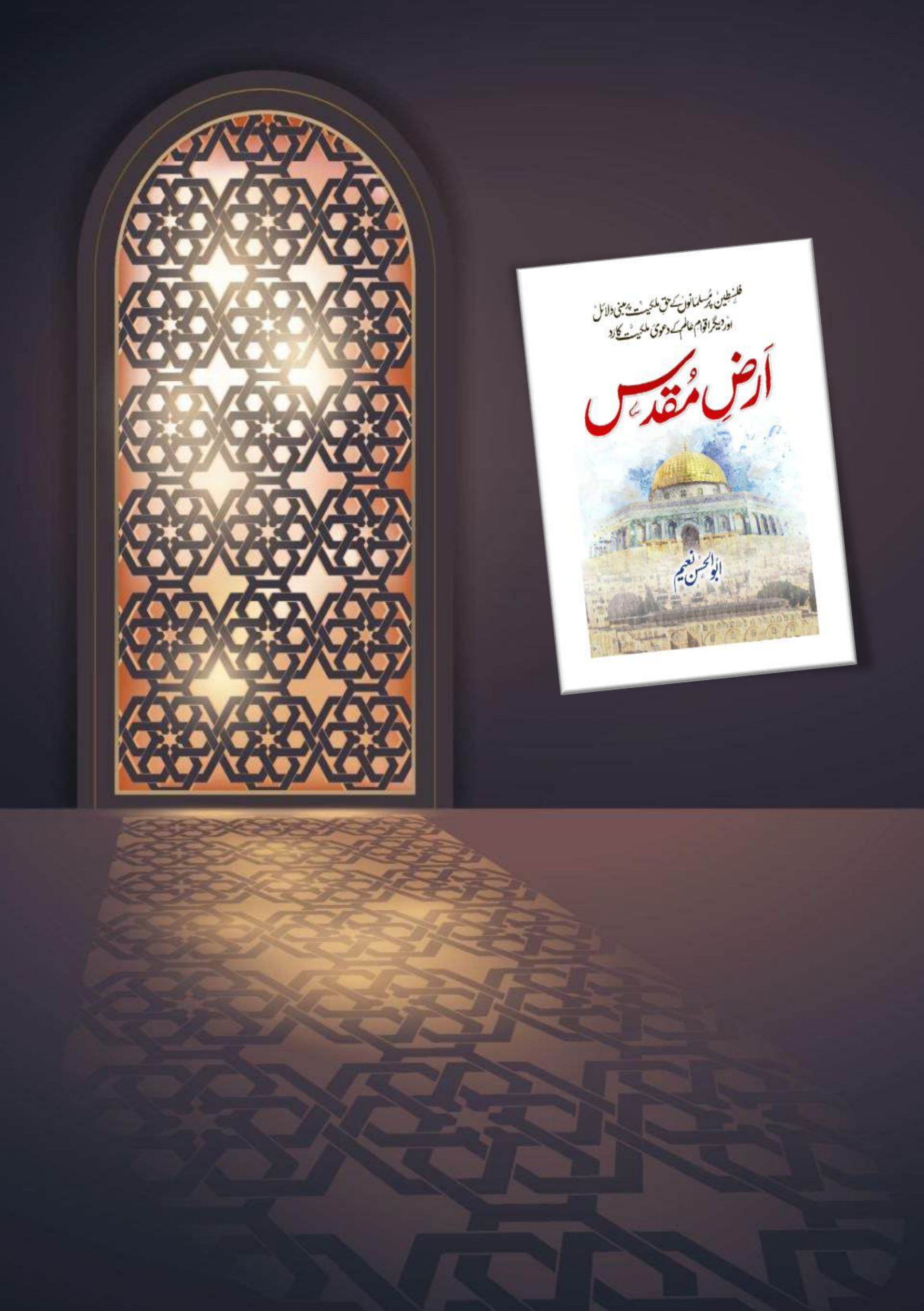
ایسا بہترین نصاب مرتب کیا جائے جو آسان فہم ہو لیکن مکمل اور جامع ہو۔

- علم الفرائض اور علم میراث کو اچھی طرح سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قواعد کے ساتھ تمرینات کا اہتمام طلبہ کے لیے مفید ثابت ہو سکتا ہے۔ چنانچہ نصابی کتاب میں بھی تمرینات موجود ہوں اور اساتذہ خود بھی طلبہ کو مشق کروائیں تاکہ عملاً ان اصولوں کی روشنی میں مسائل حل کر سکیں۔
- زبان و ادب کے باب میں عربی، اُردو اور انگریزی تینوں زبانوں میں تحریری ملکہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ طلبہ کو ایک ایسا ماحول فراہم کیا جائے جس میں وہ عربی اور انگریزی زبان میں گفتگو کا ملکہ پیدا کر سکیں۔ مثالوں اور حوارات کے ذریعے طلبہ کو مروجہ انگریزی اور عربی زبان سکھائی جائے۔ ابتدائی درجات سے لے کر اعلیٰ درجات تک یہ عملی مشق جزو لاینفک ہو۔
- معاشیات کا علم اس زمانے میں نہایت ضروری ہے۔ جدید تقاضوں کو سمجھتے ہوئے علمِ معیشت کو سمجھنا اور پھر عملاً اس کی مشق کرنا تاکہ طلباء معاشیات سے کماحقہ آگاہ ہو سکیں۔ نہایت ضروری ہے۔

- تاریخِ اسلام اور تاریخِ اقوامِ عالم کے متعلق بھی معلومات ہونا از حد ضروری ہے۔ یہ انسان کے نقطہء نظر میں وسعت کا سبب ہوتے ہیں۔
- پولیٹیکل سائنس یعنی سیاسیات کا علم بھی نہایت ضروری ہے۔ اس علم کی ایک ایسی کتاب شاملِ نصاب ہونی چاہیے جس میں جدید پولیٹکل سائنس کے مبادیات اور اسلام کے سیاسی قواعد وضوابط کا مکمل احاطہ ہو۔
- قومی و بین الاقوامی قوانین کا علم ہونا بھی ضروری ہے۔ ایسی کتب کا اہتمام ہو جو قومی و بین الاقوامی قوانین سکھائیں تاکہ طلبہ ایک محب وطن شہری بن سکیں ۔
- حفظانِ صحت کے ابتدائی اصول اور بنیادی طبی امداد کے بارے میں علم ہونا نہایت ضروری ہے۔ تاکہ معاشرے میں کبھی کسی ایمرجنسی کا سامنا ہو تو اس وقت اس کا بنیادی علم کچھ مفید ثابت ہو سکے۔

یہ چند اہم اور ضروری تجاویز تھیں جو کہ مختصراً ذکر کر دی ہیں تاکہ ہم ان پر عمل پیرا ہو کر مدارس میں رائج نصابِ تعلیم کی کمزوریوں کو دور کر سکیں اور

ایک ایسا فرد مدرسے میں تیار کر سکیں جو اسلام کے بنیادی مقاصدِ تعلیم کے حصول میں معاون و مددگار ہو۔



فلسطین پر مسلمانوں کے حق ملکیت پر مبنی دلائل
اور دیگر اقوام عالم کے دعویٰ ملکیت کا رد
ارضِ مقدس
ابو الحسن نعیم